اردو میں خردہ گیری کی چند مثالیں

خالد ندیم

Abstract:

Meaning of the word‘animadversion ’is strong criticism, a critical or censorious remarks or unfavorable comments. This article will discuss those critical writings in which a piece of writing is analyzed by carrying out all the weaknesses, flaws and defects, and thus it is proved that whether the book under review is valid or totally unreliable. The purpose of this method is to save the critics and researchers of language and literature from misguidance and scattered imagination. Looking at such writings, it may seem as if a fierce critic is pursuing a creator, but the fact is that this method of critique has revealed the actual value of many well-known books and authors. Such critics scrutinize an entire book and then present the study and all the shortcomings of the text. Though negative opinions are formed about this kind of criticism but it helps creators, critics and researchers to focus on their work more carefully. Here are some important examples of animadversions in Urdu which suggest that these critics and researchers boldly captured the personalities and influential institutions of their time. As a result, the status of some books was invalidated and some institutions had to withdraw their publications.

’خردہ گیری‘ سے مراد ’حرف گیری‘، ’نکتہ چینی‘، ’دقیقہ شناسی‘ یا ’تنقید‘ وغیرہ لیا جاتا ہے، البتہ اس کے ایک معنی کسی کتاب کے سختی کے ساتھ عیب نکالنا اور بتانا بھی ہیں۔ زیرِ نظر تحریر میں ان تنقیدی تحریروں کو زیرِ بحث لایا جائے گا، جن میں کسی کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی ایک ایک کمزوری، ایک ایک خامی اور ایک ایک عیب کی نشاندہی کی گئی ہو اور ثابت ہوتا ہو کہ زیرِ تبصرہ کتاب ساقط الاعتبار ہے یا یکسر نا قابلِ اعتماد۔

اس طریقِ کار سے مقصود یہ ہے کہ شاہراہِ زبان و ادب کے مسافروں کو گمرہی اور منتشر خیالی سے بچایا

جائے۔ایسی تحریروں کو دیکھنے سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سخت گیر نقاد کسی تخلیق کار کا تعاقب کر رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے اس طریقِ کار نے متعدد معروف کتابوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے اور متعدد نامور تخلیق کاروں، ناقدین اور محققین کی علمی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔

خردہ گیر نقاد کسی کتاب کی ایک ایک کمزوری کو واضح کرنے کے لیے پوری کتاب کو کھنگالتے ہیں اور پھر اپنے تمام تر مطالعات کو قاری کے سامنے لاکر اس تحریر کی تمام تر خامیوں پیش کرتے ہیں۔اس تجزیاتی انداز سے جہاں محقق سے متعلق کسی حد تک منفی رائے قائم ہوتی ہے، وہیں اس سے تخلیق کار، نقاد اور محقق اپنے کام کو زیادہ احتیاط سے کرنے لگتے ہیں۔ یہاں اردو میں خردہ گیری کی چند اہم مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ ان ناقدین و محققین نے نہایت جرات مندی سے اپنے وقت کی بڑی بڑی شخصیات اور بااثر اداروں کی تصانیف و تالیفات کی گرفت کی؛ نتیجتاً بعض کتابوں کی مسلمہ حیثیت باطل ہوگئی اور بعض اداروں کو اپنی مطبوعات واپس لینا پڑیں۔

......

تاریخِ ادبِ اردو میں شبلی نعمانی کا مقام و مرتبہ مسلمہ ہے اور اب انھیں کلاسیک میں شمار کیا جاتا ہے۔اوّل تو ان کے علمی کارناموں کی فہرست خاصی طویل ہے، اس پر مستزاد ان کی شخصیت اور تصانیف و تالیفات پر تحریروں کا حجم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ شبلی صدی کے موقع پر 'کتابیاتِ شبلی' مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں کے حق میں لکھنے والوں کی تعداد بہت ہے تو ان کے شخصی و نظری و علمی مخالفین بھی کم نہیں ہیں، بلکہ بعض حوالوں سے انھیں زندگی اور مابعد حیات مخالفت کا زیادہ سامنا کرنا پڑا ہے۔مثال کے طور پر سید سلیمان ندوی کے مقابلے میں انھیں مولوی عبدالحق، منشی محمد امین زبیری، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام کی تحریروں سے دوچار ہونا پڑا۔

ہر معروف شخصیت اپنی زندگی میں کسی حد تک رقابت کا شکار رہتی ہے، لیکن شبلی کی شخصیت عجب حادثات کا شکار ہوئی۔ان کی باقاعدہ مخالفت کا آغاز ان کے اپنے شاگرد، مولوی عبدالحق کی مجلسی گفتگو سے شروع ہوا، جس نے اُس وقت سنجیدہ صورت اختیار کر لی، جب ان کے زیرِ ادارت سہ ماہی اردو میں ''شعر العجم'' پر حافظ صاحب کی تحریریں شائع ہونے لگیں۔ایک معروف عالم کی طرف سے کسی ایک کتاب پر مسلسل پانچ سال تک لکھتے رہنا ادبی تاریخ کا ایک قابلِ ذکر واقعہ ہے۔

اردو زبان میں فارسی ادب کی تاریخ پر شبلی کی اس تالیف کو اوّلیت حاصل ہے۔ حافظ شیرانی نے اس موضوع پر فارسی اردو میں موجود تمام کتابوں میں سے اسے بہترین تالیف قرار دیا۔اپنی اس تنقید کو وہ شبلی کی فضیلتِ علمی کی منقصت نہیں، بلکہ اُس مروّجہ روِش کے خلاف احتجاج قرار دیتے ہیں، جس میں ہمارے مصنّفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں؛[۱] تاہم انھوں نے شبلی کو مؤرخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے

ایک بڑی حد تک غافل[۲] قرار دیا ہے، اس حوالے سے شیرانی صاحب کے ہاں سے نسبتاً طویل اقتباس دیا جا تا ہے، تا کہ ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''رطب و یابس، جو کچھ اُن کے مطالعے میں آ جاتا ہے، بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی، آگے جا کر خود ہی تردید کر جاتے ہیں۔ پہلے کچھ رائے قائم کی، بعد میں جا کر کوئی اَور نظریہ قائم کر لیا۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخِ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں، لیکن شعرائے عجم کے حالات میں اُن کے طاقت ورقلم نے بہت لغزشیں کی ہیں۔ اس خاص دائرے میں اُن کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہے اور نہ تمام سلسلۂ شعرا، ان کے دواوین اور مآثر پر کافی عبور ہے؛ سن و تاریخ، جو فنِ تاریخ کا ایک شاندار اور وقیع پہلو ہے، اس پر اوّل تو پوری توجہ نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں۔ بعض متاخرین کو مقتدمین کا پہلو نشین بنا دیا اور بعض متاخرین کو مقتدمین کا ہم بزم کر دیا ہے۔ بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابلِ عزت جگہ پائی ہے۔ عام اغلاط، جنھیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زبان زدِ عام کر دیا ہے، شعر العجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں۔''[۳]

اس تنقید، بلکہ تحقیق کا دائرہ عباس مزوری سے کمال اسماعیل تک ہے اور حافظ صاحب نے شبلی کے تاریخی بیانات پر تحقیق کی روشنی میں نقد و تبصرہ کیا ہے، جو ''تنقیدِ شعر العجم'' کے اوّلین ایڈیشن کے 589 صفحات کو محیط ہے۔ ان کے طرزِ تحقیق کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ شبلی نے صفحہ 18 پر ابوحفص حکیم سغدی کے متعلق لکھا کہ وہ 'پہلی صدی ہجر میں موجود تھا'۔ اس موقع پر شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ابوحفص بن احوص سغدی، اسغد سمرقند کا رہنے والا، فنِ موسیقی میں استادِ کامل تھا۔ ابونصر فارابی نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ موسیقار سے ملتا جلتا ایک ساز، جس کا نام شہرود تھا، اس نے ایجاد کیا۔ فارابی نے اس ساز کی شکل اپنی تصنیف میں بیان کی ہے۔ ابوحفص، بقولِ صاحبِ خزان؟ عامرہ و صاحبِ المعجم فی معاییر اشعار العجم 300ھ میں گزرا ہے۔ ابوحفص فارسی فرہنگ نگاروں کا ابوالبشر مانا جا سکتا ہے، اس کی فرہنگ کا ذکر فرہنگِ جہانگیری میں آتا ہے۔''[۴]

منوچہری کے حوالے سے شبلی کے دو بیانات کے بعد ان کے تیسرے بیان میں پہلے دو کی تکذیب ہو جاتی ہے، شبلی کے یہ بیانات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

> ''محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمانِ

سخن سبعہ سیارہ تھے، یہ ہیں: عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضاری، فرخی، منوچہری۔
محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے، جن میں فرخی، عسجدی، غضاری، منوچہری جیسے قادر الکلام بھی
شامل ہیں۔
لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ
وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا اور اس لیے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہوسکتا۔''۵

شیرانی صاحب ایک محقق کا اوّلین فرض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ، جو واقعہ بیان کرے، اس کی پوری پوری تحقیق اور تفتیش کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرلے اور ہمیشہ کے لیے اسی پر قائم ہوجائے'۔۶

شیخ فریدالدین عطّار کے نام کے حوالے سے شیرانی صاحب نے شبلی کی گرفت بھی کی اور اصلاح بھی، لکھتے ہیں:

''مَیں رفعِ تشکیک کی غرض سے ابتدا ہی میں گزارش کیے دیتا ہوں کہ علامہ شبلی شیخ عطّار کو بار بار خواجہ لکھ رہے ہیں۔ ہم خواجہ کا لفظ آج کل بھی ہر شخص کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اُن ایّام میں۔ قدما میں خواجہ کے واسطے کسی قسم کی تعمیم نہیں مانی گئی، وہ خاص خاص طبقے کے لوگوں کے ساتھ ملتا ہے، مثلاً اربابِ مناصب و دبیرانِ سلطانی کے ناموں کے ساتھ۔ علاوہ بریں 'خواجہ عطّار' کے لقب سے ایک اَور بزرگ، جو نویں صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں، ممتاز ہیں۔ ان کا پورا نام خواجہ علاءالدین عطّار ہے۔''۷

یوں دیکھا جائے تو شیرانی صاحب نے تنقید کے دَوران میں شبلی کی خامیوں پر ہی نظر نہیں رکھی، بلکہ جہاں کسی غلطی کی نشاندہی کی، اس کی اصلاح میں بھی محققانہ انداز اختیار کیا ہے۔

اس سلسلے کی دوسری تنقید کا تعلق ''آبِ حیات'' سے ہے، جس پر شیرانی صاحب کے مضامین دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ اوّل، جب انھوں نے آغا محمد باقر کی درخواست پر ''آبِ حیات'' پر تنقید لکھنا شروع کی تو اس کی تین قسطیں ''اورینٹل کالج میگزین'' میں اگست 1941ء، نومبر 1941ء اور فروری 1942ء میں شائع ہوئیں۔ یہ سلسلہ آغا محمد باقر کی ناخوشی کے باعث جاری نہ رہ سکا۔

حافظ صاحب نے آغاز میں آبِ حیات کی اسلوب کی خصوصیات، اس کے لیے معلومات کی فراہم کرنے والوں کے اسما اور موصولہ معلومات کی مکمل یا جزوی شمولیت، اس پر ہونے والی تنقید اور اس کے خوشہ چینوں کا ذکر کیا ہے۔ شیرانی صاحب باغ و بہار میں زبان اور محاورے کے لطف کی نشاندہی کے بعد لکھتے ہیں:

''آبِ حیات'' ان خوبیوں کے علاوہ طرزِ ادا میں بانکپن، سلاست کے ساتھ رنگینی، بیان کی

شیرینی، ترکیب و بندش کی خوشنمائی، زبان کے لطف اور نزاکتِ مضمون کی خصوصیات سے ممتاز ہے۔ مولانا آزاد صاحبِ طرز ہیں۔ ان کی طرز نہ ان سے پہلے وجود میں آئی اور نہ ان کے بعد کوئی اس کی تقلید کر سکا۔''۸

قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں رشید حسن خاں کے ایک مضمون 'حافظ محمود شیرانی کی تاریخی اہمیت' سے ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر چہ انھوں نے آزاد اور شبلی کی کتابوں کا تحقیق کی روشنی میں جائزہ لیا، لیکن وہ اُن دونوں اساطین کے اسالیب سے متاثر تھے اور بے ساختگی کے عالم میں بعض اوقات وہ اثر پذیری اپنے آپ کو نمایاں کر لیتی تھی، اس سے شیرانی صاحب کی اثر پذیری سے زیادہ اُس دَور میں شبلی و آزاد کے اثرات کی ہمہ گیری کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔''۹

پندرہ سولہ صفحات کی اس تمہید کے بعد حافظ صاحب نے دو اعتراضات کی بنیاد رکھی ہے، جس کی روشنی میں آئندہ صفحات میں ''آبِ حیات'' کے متعلق 'اعتراض یا حاشیہ آرائی' کی گئی ہے، یعنی شعرا کے تذکرے میں حضرت مولانا نے رقابت اور مقابلے کے پہلو کو زیادہ نمایاں کیا ہے اور دورِ اوّل و دوم و سوم کے شعرا میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے۔۱۰ اس سلسلے میں انھوں نے آبِ حیات کے کم و بیش تیس مقامات پر تحقیقی و تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ طریقِ کار یہ اپنایا ہے کہ اصل عبارت 'قولہٗ' کی ذیل میں تحریر کر کے بعد ازاں پر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ تجزیہ آزاد کے تنقیدی بیانات کی نسبت ان کے تحقیقی نقطۂ نظر سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ ''آبِ حیات'' کی پہلی اشاعت کے بعد اس پر جو تنقید ہوئی، اس کا تعلق بالعموم فراہم شدہ معلومات کے استعمال، ادوار میں شمولیت کے اعتبار سے غلط تقدیم و تاخیر اور بعض اہم شعرا کو نظر انداز کرنے سے تھا، البتہ حافظ صاحب کے تجزیاتی مطالعے کا تعلق خالصتاً تحقیقی نوعیت سے ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے:

''ولی، احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے' اور حاشیے میں اضافہ کیا ہے، 'دیکھو تذکرۂ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، مگر تعجب ہے کہ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں اورنگ آبادی لکھا ہے'۔ سند میں تذکرۂ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، یعنی مجموعۂ نغز کا حوالہ دیا ہے، لیکن اس موقع پر مولانا کو سہو ہوا ہے، کیونکہ مجموعۂ نغز میں ولی کو دکنی لکھا گیا ہے۔''۱۱

''مرزا مظہر (جانِ جاناں) کے متعلق یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ 'پھول ہاتھ نہ آئے، جو لڑی پروتا'، بلکہ برعکس کثرتِ مواد کی شکایت ہو سکتی ہے، نہ قلتِ مواد کی؛ مگر حضرت مولانا نے تمام تذکروں اور تاریخوں کو پسِ پشت ڈال کر چند بے سر و پا اور بے سند باتوں کو لے کر اور نمک مرچ لگا کر آبِ

حیات کی نقل محفل بنادیا ہے... حضرت مولانا اس موقع پر جادۂ مستقیم سے ہٹ کر ایسے میدانوں میں نکل گئے ہیں، جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ اوّل سے آخر تک ان کا قلم بے چارے مرزا کی ہجوِ ملیح میں مصروف ہے۔ ان کی حسن پسندی اور میرزا منشی پر چھینٹے اڑ آئے ہیں۔ لطیفوں کی آڑ میں ان کو تندخو اور بدمزاج ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔''۱۲

''آبِ حیات'' پر حافظ صاحب کی تنقید ایسی سخت سمجھی گئی کہ خود اس کے محرکِ اوّل نبیرۂ آزاد، آغا محمد باقر ہی اس سے ناخوش ہوگئے، چنانچہ حافظ صاحب نے یہ سلسلہ روک دیا۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اس تنقید کے بعد آبِ حیات کی شہرت اور مقبولیت معدوم ہوگئی، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان تین اقساط کی اشاعت سے اب تک حافظ صاحب کے نقطۂ نظر کو تسلیم اور اس کا احترام کیے جانے کے باوجود آبِ حیات کی اشاعت مسلسل جاری رہی ہے، گویا ''آبِ حیات'' اور ''تنقید بر آبِ حیات'' دونوں تاریخِ ادبِ اردو میں مستقل جگہ بنانے میں کامیاب رہیں۔ آبِ حیات اپنے شگفتہ اسلوب کے باعث زندہ رہی اور یہ غیر معمولی بات ہے کہ کوئی تصنیف اپنے نفسِ مضمون سے الگ صرف اسلوب کی وجہ سے زندہ جاوید رہ جائے۔

'شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق' کے نام سے حافظ صاحب کی تنقید اکتوبر 1944ء سے جنوری و اپریل 1947ء تک سات اقساط میں ہندوستانی الہ آباد میں شائع ہوئی، جنھیں حافظ صاحب نے ''دیوانِ ذوق'' پر تنقید کو ''آبِ حیات'' پر تنقیدی اقساط میں شمار کیا ہے۔۱۳

سات اقساط پر مشتمل یہ تنقید بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم ہیں، (1) تنقید ''دیوانِ ذوق'' مرتبہ آزاد، (2) ''دیوانِ ذوق'' پر آزاد کی اصلاحات، (3) ''دیوانِ ذوق'' میں آزاد کے مغالطے۔

آزاد نے ذوق کے ساڑھے سات سو دواوین دیکھنے اور ان کے خلاصے لکھنے کی اطلاع دی ہے، جس پر شیرانی صاحب نے خوب گرفت کی ہے، لکھتے ہیں:

> یہ بیان صریحاً مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ دہلی میں اُن ایّام میں کوئی ایسا کتب خانہ نہ تھا، جس میں ساڑھے سات سو یا اُس کی نصف تعداد کے دواوینِ شعرا یکجا موجود ہوں۔ یورپ کے عظیم الشان کتب خانوں میں آج بھی اساتذۂ سلف کے دواوین کی اتنی بڑی تعداد کہیں نظر نہیں آتی، چہ جائیکہ تاراج شدہ دہلی میں، جو بارہویں صدی ہجری میں دس بارہ مرتبہ لٹ چکی ہے، باقی رہے ہوں۔''۱۴

آزاد نے بتایا کہ 'استاد جب حضور کی غزل مشاعرے کے لیے کہتے تھے تو اپنی غزل اُس طرح میں نہ کہتے تھے اور کبھی کہنی بھی پڑتی تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑ جائے'۔۱۵ آزاد کے اس بیان پر شیرانی صاحب نے دلچسپ تبصرہ کیا ہے:

اللہ اللہ! استاد ذوق کو اپنے شاگرد ظفر کی خاطر داشت کس قدر منظور تھی کہ لحاظ کے مارے اپنی غزل کے بہتر اشعار مشاعروں میں پڑھنے سے احتراز کرتے تھے، لیکن مولانا کے دعوے کے مطابق شاہی غزل بھی تو استاد ہی کو تیار کرنی پڑتی تھی۔ اس سے یہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ذوق اچھے اچھے ابیات اپنے لیے محفوظ رکھتے اور خراب اور بھرتی کے اشعار حضور کی غزل کے واسطے چھوڑ دیتے۔ جاے حیرت ہے کہ مولانا نے یہ راز از خود طشت از بام کر دیا۔ طبیعتوں کا اختلاف ملاحظہ ہو کہ مصحفی، جیسا کہ آبِ حیات میں مذکور ہے، بہترین اشعار اپنے سالے کو لینے دیتے اور کوئی چرچا نہ کرتے، اِدھر ذوق ہیں کہ روکھے پھیکے اور بے لطف اشعار ظفر کے حوالے کرتے ہیں اور اس ذلیل قسم کے احسان کا ذکر اپنے شاگردوں سے کرتے ہیں۔ اُن کو پروا نہیں کہ بادشاہ بدنام ہوتے ہیں۔ وہی بادشاہ، جس نے انھیں خاک سے پاک کیا، پانچ سے سوتک تنخواہ دی، گاؤں جاگیر میں دیا، انعام واکرام سے مالا مال کیا، خلعت وخطاب سے سر بلند کیا، استادِ شاہی کا منصب بخشا، ہم چشموں میں سرفراز کیا۔ ایسے بادشاہِ والا جاہ کے ساتھ ذوق کا یہ رُسوا کن سلوک لائقِ نفرت، بلکہ موجبِ عبرت ہے۔"[۱۶]

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی جلد سوم کے صفحہ 27 سے 306 تک پھیلی ہوئی "آبِ حیات" اور "دیوانِ ذوق" پر شیرانی صاحب کی تنقید کے بعد آزاد کا ادبی مقام اور ادبی پایہ ایک انشا پرداز کا رہ گیا، البتہ ان کی تحقیق، تنقید اور ترتیب وتدوین کی حیثیت پر سوالیہ نشان ثبت ہو گئے۔

......

خردہ گیری کی روایت میں ایک نہایت اہم نام قاضی عبدالودود کا ہے۔ اس وقت ان کا مجموعہ "غالب بحیثیت محقق" پیشِ نظر ہے۔ عابد رضا بیدار نے بجا طور پر 'غالب کی راست گفتاری' کو اس طویل تنقیدی مطالعہ کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے؛ چنانچہ انھوں نے اس مضمون کو 'غالب بحیثیت محقق' کا مقدمہ اور اس موضوع پر دیگر مضامین کو اس کے ضمائم قرار دے کر غالب کی تحقیقی حیثیت کو ایک کتاب میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ فی الوقت بحث کا دائرہ 'غالب بحیثیت محقق' تک محدود رہے گا۔

قاضی صاحب نے غالب نے اس بیان کو اپنے مقالے کی بنیاد بنایا ہے کہ 'میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا'۔[۱۷] اس سلسلے میں انھوں نے الطاف حسین حالی، غلام رسول مہر اور امتیاز علی خاں عرشی کے تائیدی بیانات کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ 'میری غرض صرف یہ دِکھانا ہے کہ غالب کا دعویٰ کہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کہاں تک صحیح ہے' اور پھر 'صرف یہ دِکھانا' 198 صفحات تک پھیل گیا۔ غالب کی 'راست

گفتاری' کی تردید کے لیے قاضی صاحب نے ایرانِ قدیم اور فرہنگیں، فارسی ادب پر ان کے بیانات کے تجزیے کے بعد فارسی زبان کی ذیل میں برہانِ قاطع پر غالب کے 100 اعتراضات کا محاکمہ کیا اور فارسی شعر و ادب سے مثالیں دیتے ہوئے غالب کی تصحیحات پر گرفت کی ہے۔عربی زبان پر غالب کی دسترس سے متعلق اگرچہ قاضی صاحب کہنا ہے کہ 'انھوں نے کہیں صراحتاً عربی اچھی جاننے کا دعویٰ نہیں کیا' لیکن وہ ان کے مداحوں کے اس خیال پر کہ 'خاصی عربی جانتے تھے' انھوں نے ۲۰ مقامات پر غالب سے اختلاف کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے غالب کی اردو، ترکی و مغلی، توافقِ لسانین اور فنونِ ادبیہ پر بحث کی ہے۔آخر میں انھوں نے یہ دِکھانے کی کوشش کی ہے کہ 'غالب ان قوانینِ اخلاق کے پابند ہیں یا نہیں، جن کی خلاف ورزی ایک جویائے حقیقت کے لیے ممنوع ہے'۔[۱۹]

قاضی صاحب نے غالب کے بیانات اور ان کے تحقیقی نکات پر جامع بحث اور مثالیں پیش کر کے تردید کی ہے اور اس سلسلے میں تمام تر صورتِ حال واضح کر دی ہے۔

محمد حسین آزاد کی تحقیقات پر قاضی صاحب کی تحریروں کو ''آزاد بحیثیت محقق'' میں یکجا کر دیا گیا ہے۔سب سے پہلے ''آبِ حیات'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔قاضی صاحب کے خیال میں (1) اکثریت آزاد کی نثّاری کی معترف ہے، مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مردِ میدان تھے اور (2) اقلیت مصر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے انشا پرداز ہی نہیں، ایک بڑے محقق بھی تھے؛[۲۰] چنانچہ قاضی صاحب نے مذکورہ دونوں بیانات کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے بعض کاموں کا جائزہ لیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے 300 بیانات پر گرفت کی ہے، جن میں سے 100 کا تعلق ''آبِ حیات'' اور 200 کا ''دیوانِ ذوق'' سے ہے۔قاضی صاحب کا اندازِ تحقیق ملاحظہ کیجیے:

> ''خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے اور بی چمو (ساقن) کی زبان سے کیا ہے۔'بھٹیاری کے لڑکے لیے لیے خالق باری لکھ دی، ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہوگا'؟ (الف 76) خالق باری، جیسا کہ شیرانی کی تحقیقات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے، امیر خسرو سے کچھ تعلق نہیں رکھتی۔آزاد کے زمانے میں یہ بات کہ امیر خسرو اس کے مصنف ہیں، شہرتِ عام رکھی تھی، اس لیے آزاد اسے باور کرنے کے لیے زیادہ قابلِ الزام نہیں، لیکن بھٹیاری والی حکایت خود ان کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔
>
> خسرو بی چمو کے یہاں حقہ پیا کرتے تھے۔(الف 76) تنبا کو خسرو کے زمانے میں ہندوستان میں نہ تھا اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے۔ حقے سے کچھ اَور مراد ہے تو آزاد کو اس کی وضاحت کرنی تھی۔''[۲۱]

قاضی صاحب نے آزاد کے بیانات پر تبصرہ کر کے نتائج بتا دیے ہیں۔ان نتائج کو مختصر تو کہا جا سکتا ہے،

جامع نہیں؛ کیونکہ ان نتائج سے فیصلہ کن رائے سامنے آتی ہے، البتہ ان نکات کے لیے اگر شیرانی صاحب کے ہاں دیکھا جائے تو وہاں اختصار اور جامعیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ مذکورہ بالا نکتہ 2 سے متعلق حافظ صاحب کا کہنا ہے کہ 'قصے کا ناقابلِ قبول حصہ وہ ہے، جس میں چھوسا قن حقہ بھر کر امیر کی خدمت میں لاتی ہے'۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ 'کیا ایسے قدیم زمانے میں، جیسا کہ امیر خسرو کا ہے، حقہ موجود تھا'، ساتھ ہی بتاتے ہیں کہ 'حقے کا وجود تمباکو کا تابع ہے'، جو بقول آزاد کے، 'امریکا کا لفظ ہے، یورپ کے راستے ہوا کبر کے عہد میں یہاں پہنچا'۔ یہاں تک تو وہ آزاد کے دیگر بیان سے اُن کے پہلے بیان کی تردید کرتے ہیں، پھر پرتگالیوں کے ذریعے امریکا سے اس کی یورپ اور پھر جزائز ہند اور دکن میں تمباکو کی آمد کی اطلاع دے کر اکبر کے رتن ابوالفضل کے ملازم اسد بیگ کے وقائع سے جنوبی ہند سے دربارِ اکبری میں تمباکو کے سفر کی رُوداد بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ احمد آباد گجرات میں مقیم نظیری نیشاپوری کے ایک فارسی غزل پیش کرتے ہیں، جس میں اوّل اوّل تنبا کو کی تعریف ملتی ہے۔[۲۲]

حافظ صاحب ''آبِ حیات'' پر تین اقساط سے زیادہ نہ لکھ پائے، چنانچہ یہ تنقید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی؛ اس کے برعکس قاضی صاحب نے ''آبِ حیات'' کے جملہ مندرجات پر بحث کی ہے، اس لیے انھیں اختصار سے کام لینا پڑا۔ علاوہ ازیں اس حوالے سے دونوں محقق کے مزاج اور طریقۂ تحقیق کے فرق کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

......

عہدِ حاضر میں اردو تحقیق میں سنجیدگی اور متانت کا تعلق رشید حسن خاں کی ذات اور ان کے کام سے رہا ہے۔ عہدہ و منصب، نام و نمود، خوف یا دباؤ ان کی زندگی کی لغت میں کہیں جگہ نہ پا سکے۔ انھوں نے جو کچھ حق سمجھا، لکھ دیا اور اس سلسلے میں ناموروں یا نامور اداروں کے زیرِ اثر اپنے فیصلوں سے رجوع نہ کیا، بالخصوص علی گڑھ یونیورسٹی اور اردو لغت بورڈ کراچی جیسے معروف اداروں کے تحقیقی کاموں پر ان کی گرفت کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ وہ اردو زبان میں جدید اصولِ لغت نویسی کی روشنی میں مرتب کیے گئے لغت، جزئی و کلی مسائل پر حاوی قواعد کی مبسوط کتاب اور ادب کے ارتقا کی آئینہ دار مستند تاریخ کی کمی محسوس کرتے تھے۔[۲۳]

ان میں سے ذاتی طور پر وہ صرف قواعد پر کام کر سکے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا، البتہ لغت اور تاریخ کے لیے انھیں وقت نہیں ملا۔ ''علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو'' اور ''تاریخِ ادبِ اردو'' چھپیں تو انھوں نے ان دونوں کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کے پیشِ نظر کس قسم کی تاریخ کا منصوبہ تھا۔

1962ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے تاریخ ادبِ اردو شائع ہوئی تو رشید حسن خاں کا پہلا تاثر یہ تھا کہ 'غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اس کو مرتب کیا گیا ہے'۔[۲۴] مرتبین کا دعویٰ ہے کہ 'یہ کتاب مغربی تاریخوں کے انداز و معیار کو ملحوظ رکھ کر، اُسی طرز پر مرتب کی گئی ہے'،[۲۵] جب کہ رشید حسن خان کے خیال میں، اس تاریخ کو ایسے مضامین کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، 'جن میں نہ باہم ربط ہے، نہ تناسب و توافق۔ اس کے بجائے متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط سنین، غلط انتسابات، مفروضات اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی

ہے'۔٢٦ محقق نے کتاب کے متعدد مقامات پر سنین کے غلط اندراجات کی نشاندہی کی ہے۔صرف ایک مثال سے انداز ہو جائے کہ کتاب میں تاریخی و تحقیقی انتشار کی کیا صورتِ حال ہے:

''ص 38 پر شیخ باجن کا سالِ وفات 1506ء لکھا ہوا ہے۔دوسرے مقالہ نگار نے ص 105 پر آپ کا سنِ ولادت 790ھ، 1388ء لکھ کر وفات کے متعلق لکھا ہے کہ 121' سال کی عمر میں وفات پائی'۔سالِ ولادت 1388ء میں 121 جوڑے جائیں تو سالِ وفات 1509ء ہوگا۔تیسرے مقالہ نگار نے ص 259 پر سالِ ولادت 702ھ، 1303ء اور سالِ وفات 790ھ، 1388ء لکھا ہے۔گویا جو سنہ ایک مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق سالِ وفات ہے، وہ دوسرے کی تحقیق کے مطابق سالِ ولادت ہے۔خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے۔''٢٧

اسی طرح ہجری و عیسوی تقویم کے سلسلے میں بھی بے احتیاطی کی مثالیں ملتی ہیں اور مادۂ سنین کے تعینات میں بھی بے اصولی اور غلط انتسابات کا سلسلہ جاری رہا۔مسلمان حکمرانوں اور صوفیہ کے بارے میں غیر متعلقہ، غیر ضروری اور نا روا بیانات سے متعلق محقق نے سوال کیا ہے کہ اس کا اصل موضوع سے کیا تعلق ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ 'اس میں ایسی بحثیں آ گئی ہیں اور اُن کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ وہ کسی پس منظر کو نمایاں کرنے کے بجائے ایک خاص اندازِ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں، جن کو تاریخ ادب سے کچھ تعلق نہیں'۔٢٨

علاوہ ازیں اشعار کے غلط انتساب، تاریخی حقائق اور عہد بہ عہد ارتقاے زبان سے متعلق مرتبین کی کمزور معلومات، سنین کے اندرج میں غیر یکسانیت، ضروری حوالوں سے بے نیازی، کتابوں کے غلط نام اور کتابوں کے غلط انتسابات اور سب سے بڑھ کر اشاریے کی شتر گربگی پر انھوں نے بڑی تفصیل سے مدلل گفتگو کی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے رشید حسن خاں نے اس کتاب کی حالت ناگفتہ بہ قرار دی ہے۔غیر مناسب اندازِ بیان اور غلط جملوں کی بہتات کے پیشِ نظر 'بعض نئے لکھنے والوں کی کتابیں مل کر بھی اس کی برابری کا دعویٰ بہ مشکل کر سکتی ہیں'۔اس سلسلے میں انھوں نے نگرانِ اعلیٰ کے لکھے ہوئے چند جملے پیش کر کے کتاب کے زبان و بیان کا نقشہ کھینچ دیا ہے:

''(1) اس تاریخ کی پہلی جلد میں ایک لسانیاتی مقدمہ دیا گیا ہے... (2) جدید اصولوں کی روشنی میں کام کر کے ہماری تاریخ کے کئی تاریک گوشوں سے نقاب اٹھایا تھا... (3) تذکروں میں شعرا عام طور پر حروفِ تہجی کے اعتبار سے لیے گئے تھے... (4) خام مواد کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے، ورنہ یک طرفہ ہو جانے کا امکان ہے۔''٢٩

اس کے بعد انھوں نے کتاب کے مختلف ابواب سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں اور پھر کتاب کی مذکورہ کمزوریوں کے پیشِ نظر اس کتاب کے مصرف پر سوال اٹھایا ہے اور اپنا فیصلہ سنایا ہے:

''ابھی اس کی باقی جلدیں نہیں چھپی ہیں، مَیں اربابِ اختیار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ طلبہ کی بے چارگی اور اردو کی بے مایگی پر رحم کھا کر اُن جلدوں کو طومارِ اغلاط اور متضاد بیانات کا مجموعہ نہ بننے دیں۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو نظرِ ثانی کے لیے آمادہ کیا جائے، جو واقعی اس کا اہل ہو۔''[۳۰]

رشید حسن خاں کے اس تبصرے کا یہ اثر ہوا کہ اس تاریخ کی جلد کو واپس لے گیا تھا۔ یوں ایک طرف قومی سرمایہ ضائع ہونے سے بچ گیا تو دوسری جانب طالبانِ علم و آگہی گمرہی سے اور امامانِ ادب بدمزگی سے محفوظ رہے۔

اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی حیثیت بنیاد گزار کی ہے۔ ان کی مصنفہ ''تاریخِ ادبِ اردو'' (مطبوعہ 1977ء) ادبی تاریخ نویسی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب چونکہ جمیل جالبی ہی دنیا میں نہیں رہے، لہٰذا اس کی پانچویں جلد کا امکان نہیں رہا۔

رشید حسن خاں مؤلف کی محنت کے قائل ہیں اور نقطہ نظر کے ممکنہ اختلاف کے باوجود سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تعلقِ خاطر کے ساتھ یہ کام کیا ہے، لیکن اس تالیف میں در آنے والی فروگذاشتوں اور تسامحات کی نشاندہی بھی کرتے ہے، تا کہ اس تاریخ کی اگلی جلدوں ان کمزوریوں سے بچا جا سکے۔ رشید حسن خاں نے درج ذیل امور کی طرف توجہ دِلائی ہے:

1۔ ثانوی یا اس سے بھی کم درجہ حوالوں پر استدلال کی بنیاد رکھی ہے اور بہت سے مقامات پر سرے سے حوالہ ہی نہیں دیا۔

2۔ تحقیق کے نقطہ نظر سے قابلِ قبول اور نا قابلِ قبول مآخذ میں امتیاز نہیں کیا اور دونوں طرح کے مآخذ سے ایک ہی انداز سے استفادہ کیا ہے۔

3۔ سنین کے ذیل میں عام طور پر حوالہ نہیں دیا۔

4۔ بہت سے مقامات پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے کتاب کے کس اڈیشن سے کام لیا ہے اور یہ کہ وہ کتاب یا وہ اڈیشن بجائے خود بھی قابلِ اعتماد ہے؟

5۔ قبولِ روایت کے آداب کو اکثر مقامات پر نظر انداز کیا ہے اور غیر معتبر راویوں کی روایتوں کو جانچے پرکھے بغیر قبول کر لیا ہے۔

6۔ نثر اور نظم کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، اُن کے ذیل میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ صحتِ متن کے لحاظ سے کیا وہ واقعتاً قابلِ اعتماد ہیں؟

7۔ تنقیدی بیانات بعض جگہ تاریخ نگاری کے پیمانے سے نکل گئے ہیں اور اس طول بیانی

نے تاریخ کے دائرے کو نقصان پہنچایا ہے۔

8۔ زبان اور ادب، جو دو مستقل موضوع ہیں، اُن کو مؤلف نے اس طرح ایک دوسرے میں الجھا دیا ہے کہ زبان کی تاریخ کا مسئلہ، پریشاں خیالی کا شکار ہو کر رہ گیا۔[۳۱]

اس سلسلے میں انھوں نے مضمون کے آئندہ پچاس صفحات میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں اور اپنی آرا کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ بظاہر اتنے اعتراضات کے بعد اس تاریخِ ادب کا بھی وہی حال ہونا چاہیے تھا، جو ''علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو'' کا ہوا تھا، لیکن چونکہ ان اعتراضات کا تعلق تالیف کے کلیات کے بجائے جزئیات سے تھا اور پھر یہ بھی مؤلف نے یہ کتاب کسی ادارے کی طرف سے شائع نہیں کی تھی، چنانچہ مذکورہ کمزوریوں کے باوجود تاریخِ ادبِ اردو کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلد شائع ہو گئی۔ مرحوم مؤلف نے مبصر کے سنجیدہ اعتراضات کو یقیناً پیشِ نظر رکھا ہوگا اور بقیہ جلدوں میں ان سے استفادہ بھی کیا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب کی تواریخ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ تاریخ اپنی قدر و قیمت میں سب سے نمایاں ہے۔ اس میں در آنے والی بعض خامیوں کی نشاندہی درست ہے، لیکن جب تک اس سے بہتر اور جامع تاریخ نہ لکھی جائے گی، اس کی یہ حیثیت باقی رہے گی۔

رشید حسن خاں کی طرف سے خردہ گیری کی تیسری مثال اردو لغت بورڈ کی پہلی جلد پر ان کے بھرپور تبصرے سے دی جا سکتی ہے۔ بڑے سائز کے 1172 صفحات کی یہ جلد الف مقصورہ پر مشتمل ہے۔ اس جلد کے مطالعے سے مبصر کا پہلا تاثر یہ تھا کہ

> 'لغت کی حد تک غلط اندیشی اور غلط نویسی کی شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو، جو اس کتاب کے صفحات میں محفوظ نہ ہو اور طرح طرح کی غلطیوں کی اس قدر بہتات ہے کہ بآسانی اس کو پشتارۂ اغلاط کہا جا سکتا ہے'۔[۳۲]

رشید حسن خاں نے دیباچہ لغت میں مدیرِ اعلیٰ کے بیانات پر سخت گرفت کی ہے اور ان کے ہر دعوے کو باطل ثابت کیا ہے۔ انھوں نے لغت میں درج ذیل کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے:

1۔ جو اسناد فراہم کی گئی ہیں، اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

2۔ یہ التزام نہیں کیا گیا کہ صرف معتبر مطبوعہ یا خطی نسخوں سے کارڈ تیار کیے جائیں۔

3۔ دوسرے لغات سے جو اسناد نقل کی گئی ہیں، اُن کا اصل تصانیف سے مقابلہ نہیں کیا گیا۔

۴۔ بعض معروف کلاسکی کتابوں کے بھی سب الفاظ شاملِ لغت نہیں ہو سکے۔

5۔ ''امیر اللغات''، ''فرہنگِ آصفیہ''، ''سرمایۂ زبانِ اردو''، ''نفائس اللغات'' اور ''نور اللغات'' کے اندراجات سے اگر اِس لغت کے اندراجات کا مقالہ کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ اُن لغات میں جو نہایت کارآمد معلومات درج ہیں اور جن کی اہمیت اور ضرورت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، اُن کا اس لغت میں نام و نشان نہیں پایا جاتا۔

6۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بلحاظِ لغت الفاظ کی غیر حقیقی صورتوں کو حقیقی فرض کر کے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔

7۔ صحتِ املا کا التزام ملحوظ نہیں رکھا گیا۔۳۳

اس سلسلے میں تفہیم کے صفحہ 181 سے 207 پر متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں اور اس لغت کو نا قابلِ اعتنا اور نا قابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں کا کہنا ہے کہ اس کے سب غلط اندراجات کا احاطہ کیا جائے تو اس سے بھی ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ انھوں نے اس تبصرے میں چند مقامات کا جائزہ لیا ہے، جس سے ان کی تفصیل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، چنانچہ ان کے خیال میں تفصیل اور استیعاب کی نہ گنجائش ہے، نہ ضرورت۔۳۴

......

حافظ محمود شیرانی نے شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' اور محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' پر تنقید لکھی اور یقیناً سخت گرفت کی اور اس کے لیے انھوں نے دلائل سے ان کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی، نتیجتاً ''آبِ حیات'' کی تحقیقی اور ''شعر العجم'' کی تاریخی قدر و قیمت بہت حد تک متاثر ہوگئی، البتہ ''آبِ حیات'' کی انشا پردازی اور ''شعر العجم'' کی تنقیدی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ قاضی عبدالودود نے مرزا غالب کی تحقیق کا محاسبہ کیا اور مثالوں کا انبار لگا دیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی اس تحقیق کے نتیجے میں غالب کی عظمت میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے؛ البتہ جب رشید حسن خاں نے آلِ احمد سرور کی مرتبہ ''علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو'' کا تنقیدی جائزہ لیا تو یہ کتاب چھپنے کے بعد چھپ کر رہ گئی، پھر جب انھوں نے اردو لغت بورڈ کی پہلی جلد پر تبصرہ کر کے اس کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

سطورِ بالا سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کتاب میں جان ہو تو وہ سخت سے سخت تنقید کو بھی برداشت کر جاتی ہے، جب کہ کمزور کام تنقید کا ایک وار نہیں سہہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خردہ گیری میں محقق ایک طرف نام نہاد علما کی نظر میں ناپسندیدہ قرار پاتا ہے، جو سہل انگاری سے علم کی راہیں کھوٹی کرتے ہیں اور دوسری جانب عام قارئین سے بھی داد وصول نہیں کر پاتا، کیونکہ انھیں ان حقیقتوں سے کم ہی سروکار ہوتا ہے؛ چنانچہ خردہ گیری کے عمل میں مبصر کو اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ خردہ گیر نقاد اپنی ہستی کی قیمت پر دنیاے علم و ادب کی تاریکیوں کو دور کرتا ہے اور تاریخ زبان و ادبِ اردو کو غلط اور گمراہ کن نتائج سے بچاتا ہے۔ چونکہ اس کے ثمرات بالعموم تلخ ہوتے ہیں، اس لیے بہت کم محققین اس کوہ پیمائی کی ہمت کر پاتے ہیں۔ آج اگر حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں نہیں ہیں تو ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر رفاقت علی شاہد کے بعض تجزیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے کو فروغ دیں گے۔ امید ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا رہے گا اور اردو زبان و ادب کی تاریک راہوں کو روشن کرنے والے ہمیشہ موجود رہیں گے۔

حواشی:

۱۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقیدِ شعر العجم،(دہلی:انجمن ترقی اردو(ہند)،۱۹۴۲ء)ص الف ب

۲۔ ایضاً،ص۲

۳۔ ایضاً،ص۳۔۲

۴۔ ایضاً،ص۶

۵۔ شعرالعجم،ص۶۰،۶۱،۱۸۷

۶۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقیدِ شعر العجم،(دہلی:انجمن ترقی اردو(ہند)،۱۹۴۲ء)ص۶۲

۷۔ ایضاً،ص۳۸۳

۸۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقید برآبِ حیات مشمولہ: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد سوم)، (لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۰۰ء)ص۲۷

۹۔ خاں،رشید حسن،تدوین، تحقیق، روایت،(دہلی:ایس اے پبلشرز،۱۹۹۹ء)ص۲۰۱۔۲۰۰

۱۰۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقید برآبِ حیات مشمولہ: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد سوم)،ص۴۲

۱۱۔ ایضاً،ص۶۸۔۶۷

۱۲۔ ایضاً،ص۷۸۔۷۷

۱۳۔ ایضاً،ص۱۱۸۔۱۱۷

۱۴۔ ایضاً،ص۱۳۸

۱۵۔ محمد حسین آزاد،مولانا،آب حیات،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،س ن)ص۱۲۵

۱۶۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقید برآبِ حیات مشمولہ: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد سوم)، ص۱۶۲۔۱۶۱

۱۷۔ عبدالودود،قاضی،غالب بحیثیت محقق،(پٹنہ:خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،۱۹۹۵ء) ص نو

۱۸۔ ایضاً،ص دس

۱۹۔ ایضاً،ص۱۸۹

۲۰۔ عبدالودود،قاضی،محمد حسین: آزاد بحیثیت محق،(پٹنہ:ادارہ تحقیقاتِ اردو،۱۹۸۴ء) ص۱

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ شیرانی،حافظ محمود،تنقید برآبِ حیات مشمولہ: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد سوم)،ص۶۶

۲۳۔ خاں،رشید حسن،ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ،(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء)ص۲۵۸

۲۴۔ ایضاً
۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ ایضاً،ص ۲۵۹
۲۷۔ ایضاً،ص ۲۶۳
۲۸۔ ایضاً،ص ۲۷۱
۲۹۔ ایضاً،ص ۲۸۶
۳۰۔ ایضاً،ص ۲۸۸۔۲۸۷
۳۱۔ ایضاً،ص ۲۹۲۔۲۹۱
۳۲۔ تفہیم، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء) ص ۱۷۶
۳۳۔ ایضاً،ص ۱۷۵
۳۴۔ ایضاً،ص ۱۸۰

ماخذ

۱۔ خاں، رشید حسن، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء
۲۔ خاں، رشید حسن، تدوین، تحقیق، روایت، دہلی: ایس اے پبلشرز، ۱۹۹۹ء
۳۔ شیرانی، حافظ محمود، تنقیدِ شعر العجم، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۲ء
۴۔ شیرانی، حافظ محمود مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد سوم)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۰ء
۵۔ عبدالودود، قاضی، محمد حسین: آزاد بحیثیت محقق، پٹنہ: ادارہ تحقیقاتِ اردو، ۱۹۸۴ء
۶۔ عبدالودود، قاضی، غالب بحیثیت محقق، پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء
۷۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آبِ حیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س ن